سعادت حسن منٹوعصر حاضر کے آئینے میں: ایک مطالعہ

Dr.Shaikh Maheboob (Mahboob Saqib)

Department of Urdu, Shivaji Mahavidyalaya,Udgir-413517 - India

اردو تنقید کے منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہماری تنقید نے اپنے فرائض منصبی سے اکثر اوقات کنارہ کشی کی ہے، فن کار کو اس کا حق اس وقت نہیں دیا جب دینا چاہیے تھا۔ مردہ پرستی ہمارے تنقید کی خاص شناخت ہے ہمارے ناقدین 'قدر مردم بعد مردن' کے قائل ہیں اس لیے کسی زندہ ہستی کی حقیقی عظمت کا اعتراف کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ فن کار کی سچی قدر اس کی حیات میں نہیں کی گئی جس کا وہ حق دار ہوتا ہے۔ اس ''ناقدریِ ابنائے وطن'' کی وجہ سے میرؔ و غالبؔ جیسے بلند مرتبہ شعرا بھی تادم حیات اس بات کے شاکی رہے کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کی ۔منٹو بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ قانون کی اصطلاح میں مشہور کہاوت ہے ''فیصلے میں تاخیر، ناانصافی کے مترادف ہے'' منٹو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے اپنی حیات میں وہ رتبہ وہ درجہ نہیں دیا گیا جس کا وہ حق دار تھا لیکن اب دیر آئے درست آئے کے مصداق منٹو شناسی کا کام دنیائے ادب میں ہو رہا ہے۔ ۲۰۱۲ء میں منٹو کی صد سالہ تقاریب کا اہتمام ذوق وشوق سے کیا گیا۔ سیمینار رکھے گئے، اخباروں نے منٹو کی شخصیت وفن پر مضامین کی اشاعت کا اہتمام کیا، رسائل نے خصوصی نمبر نکالے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی 'ہندوستانی پرچار سبھا کے محقق محمد حسین پرکار کی مرتبہ کتاب ''سعادت حسن منٹو عصر حاضر کے آئینے میں'' کے عنوان سے حال ہی ادبی دنیا میں وارد ہوئی ہے۔

تحقیق، تنقید، ترتیب، تدوین وترجمہ اور ادارت رسالہ 'ہندوستانی زبان' کے حوالے سے پرکار صاحب کا نام نہ صرف ہندو پاک کے علمی وادبی حلقوں میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے بلکہ امریکہ، جاپان، برطانیہ، جرمنی، ایران اور دیگر ممالک میں بھی انھیں بہ نظر استحسان دیکھا جاتا ہے۔ مہاراشٹر کے ایک چھوٹے سے قصبے بانکوٹ میں، ۱۰ مئی ۱۹۳۸ء کو پیدا ہونے والے پرکار صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز پیشہء تدریس سے کیا۔ اپنی ذہانت وفراست سے اسکول سے کالج اور کالج سے ریسرچ سینٹر تک ترقی کے مدارج طے کیے۔ موصوف علم وادب کے متنوع شعبوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ انہیں اردو اور مراٹھی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ تاحال ان کے قلم سے جو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ان کے عناوین اس طرح ہیں (۱) 'اردو ادب اور گاندھیائی افکار' (تحقیق) (۲) 'باقی رہے نشان ہمارا (قومی یکجہتی پر مبنی کہانیوں کا مجموعہ) (۳) 'دریچہ' (مراٹھی تخلیقات کے اردو تراجم) (۴) 'بجلی نے کہا دھرتی سے' (مراٹھی سے، ترجمہ) (۵) 'عکس' (مراٹھی خاکوں کا مجموعہ) (۶) پریم چند: ہندی جہتیں' (مرتبہ) (۷) 'سعادت حسن منٹو عصر حاضر کے آئینے میں' (مرتبہ) متذکرہ تمام کتابیں ہندوستانی پرچار سبھا کا مخزونہ ہیں۔ پرکار صاحب مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر کے ہندوستانی پرچار سبھا میں اردو ریسرچ آفیسر کے عہدے پر فائز ہیں اور اس کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ذو لسانی سہ ماہی رسالے 'ہندوستانی زبان' کے شریک مدیر بھی ہیں۔ اہم بات یہ کہ پچھلے تین دہائیوں سے غیر اردو داں طبقے کو اردو سیکھاتے ہوئے اردو کی شیرینی وحلاوت کو غیر اردو داں حلقوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ ان کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات کے علاوہ اردو ومراٹھی زبانوں کے ادب کو ہم آہنگ کرنے کے پیش نظر امریکہ کے معروف ادارے 'بائیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ' نے انہیں 'مین آف دی ایر ۲۰۰۳ء' کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ ۲۰۰۷ء میں مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی نے ان کی کتاب 'عکس' پر انہیں انعام سے نوازا۔

زیر مطالعہ کتاب 'سعادت حسن منٹو عصر حاضر کے آئینے میں' کو مرتب نے منٹو کے مداحین اور معترضین کے نام مُعَنوَن کیا ہے جو مرتب کے نظریہء تنقید

کے متوازن ہونے کی علامت ہے۔کتاب کو دو حصوں تقسیم کیا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں منٹو کے فن وشخصیت سے متعلق چودہ مضامین ہیں ان میں بارہ تازہ اور دو مطبوعہ مضامین 'قندمکرر' کے طور پر شامل ہیں دوسرے حصے میں منٹو کے دو اہم افسانے ''نیا قانون'' اور'' اُلّو کا پٹھا'' کو جگہ دی گئی۔کتاب میں شامل مضامین تحقیقی ،تنقیدی اور تجزیاتی مزاج کے ہیں۔منٹو کے تلفظ کے تعلق سے بڑے عجیب مغالطے پائے جاتے ہیں لیکن فاضل مرتب نے 'اپنی بات' میں منٹو کے تلفظ کے تعلق سے ایک نہایت اہم بات پروفیسر صادق کے حوالے سے واضح کردی کہ منٹو نہ' مُنٹو' ہے نہ 'مِنٹو' بلکہ وہ 'مَنٹو' ہے۔جس کے معنی منٹو کے مطابق 'ڈیڑھ سیر کا بٹہ' کے ہیں۔ ان کے آباواجداد دراصل کشمیر کے سارَسوَت برہمن تھے اور ان کی آل 'مَنٹو' تھی۔منٹو پر ان کی حیات میں فحاشی وعریانی کے لیبل لگائے گئے لیکن زمانہ سب سے بڑا منصف ہے اور ایک سچا فن کار جانتا ہے کہ آج نہیں تو کل زمانہ اس کی تخلیقات کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گا دنیائے ادب میں ایسے حالات کا سامنا بڑے بڑے فن کاروں کو کرنا پڑا۔کیٹس کے ساتھ بھی یہ ہوا۔کیٹس پیشے کے اعتبار سے کمپاؤنڈر تھا لیکن فطری طور پر نہایت بلند پایہ شاعر تھا جب اس نے اپنی ابتدائی نظمیں اپنے دور کے نقادوں کے سامنے پیش کی تو وہ ششدر رہے گئے لیکن بد دیانتی سے اس کی نظموں پر رائے زنی کرتے ہوئے فرمایا 'کیٹس صاحب آپ کی نظموں سے دواؤں کی بو آتی ہے لحاظہ ان کی مرہم پٹی کیجیے۔کیٹس پر ان کی متعصّبانہ تنقید کا اتنا بُرا اثر ہوا کہ وہ دق کا شکار ہوگیا اس نے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور ایک خط میں لکھا ایک دن دنیا میری تخلیقات کو سرآنکھو پر رکھے گی میرا نام شیکسپیئر ،ملٹن وغیرہ کے ساتھ لیا جائے گا، ہوا بھی یہی۔آج دنیا بھر میں کیٹس کا نام دنیا کے عظیم فن کاروں کے ساتھ لیا جارہا ہے۔پرکار صاحب نے اپنی بات میں منٹو کے افسانوں کے تعلق سے بجا فرمایا: ''ٹھنڈا گوشت، بو، کالی شلوار' چاہے کوئی افسانہ ہو، نئے زمانے ، نئے رجحانات نے ان سے فحاشی کا لیبل نکال دیا ہے۔اب انہیں ان کے پس منظر کو حالات حاضرہ کے ساتھ تقابلی انداز سے پرکھا جارہا ہے اور محسوس کیا جارہا ہے کہ ان کا خالق اپنے دور میں قدر کی نگاہ سے بھلے نہ دیکھا جاتا ہو آج کا قاری اسے انسانی اقدار پر پرکھ رہا ہے'' (ص ۷) فاضل مرتب نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ منٹو کے ابتدائی افسانے طویل ہوا کرتے تھے لیکن (خالی بوتلیں خالی ڈبے) ۱۹۵۰ کے بعد منٹو کے افسانوں سے طوالت ختم ہوگئی۔

کسی مرتبہ کتاب کی قدر کا اندازہ اس کے مضمون نگاروں کی فہرست دیکھ کر ابتدائی طور لگایا جاسکتا ہے۔مذکورہ کتاب میں اردو کے جن ادیبوں کے مضامین شامل ہیں ان میں سے اہم کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: کے کے کھلر، پروفیسر صادق (دہلی) پروفیسر علی احمد فاطمی (الہ آباد) نورشاہ (سری نگر) محمد ایوب واقفؔ، محمد اسلم پرویز، م۔ناگ (ممبئی)۔ پہلا مضمون 'منٹو اردو ادب کا سیاہ حاشیہ' تاثراتی ہے۔کے کے کھلر صاحب کے اس مضمون سے یوں لگتا ہے کہ وہ منٹو کی برسی پر جذبات کی رو میں بہتے چلے گئے۔انہوں نے منٹو کے مخالفین پر بھرپور وار کیے ان میں پروفیسر نما نقاد، دور حاضر کے وہ پبلیشرز جو منٹو کی تصانیف کو غیر قانونی طور پر شائع کر کے لاکھوں کمارہے ہیں، لیکن اس کا معاوضہ منٹو کے وارثین تک نہیں پہنچاتے، بھی شامل ہیں۔فاضل مضمون نگار نے منٹو کے تعلق سے وارث علوی کی تنقید کو یک طرفہ قرار دیا۔ہمارا یہ کہنا ہے کہ ؎ 'چمن میں اختلاف رنگ وبو سے بات بنتی ہے' جب تک کسی فن کار کی خوبیاں اور خامیاں سامنے نہیں آتی اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنا یا اس کے تعلق سے کوئی فیصلہ کرنا بے جا ہے۔منٹو کے معترضین نہیں ہوتے تو منٹو کا مطالعہ صحیح سمت نہیں ہوتا، منٹو پر جتنے زیادہ اعتراضات کئے گیے منٹو کے فن کی اتنی ہی گرہیں کھلتی گئیں اور منٹو کے معترفین و مداحین کا دائرہ اس سے چار گنا زیادہ بڑھا۔اس مضمون میں، منٹو کے والد، بہن ، بھائیوں کے برے برتاؤ، منٹو کی کشمیر جانے کی ادھوری تمنّا، لفظ منٹو کا مطلب، منٹو کا اپنی اہلیہ صفیہ سے حسن سلوک، منٹو کی شہر بدری، زندگی کے آخری ایام میں منٹو کا سسرال کے سہارے پڑے رہنا، لوگوں کے تلخ رویے جنہوں نے منٹو کو ذہنی اور جسمانی اپاہج بنادیا تھا، منٹو کے اس خط کا ذکر جسے منٹو نے اپنی حیات میں پوسٹ نہیں کیا تھا جس میں منٹو نے پنڈت نہرو سے مختلف شکایتیں کی تھیں اور اپنی تحریروں سے متعلق نہرو سے رائے بھی طلب کی تھی۔اس خط کو منٹو نے 'گنجے فرشتے کا دیباچہ قرار دیا تھا اور گنجے فرشتے کو نہرو کے نام معنون کرنے کی بات بھی کہی تھی لیکن یہ خط بعد میں منٹو کی کتاب 'بغیر عنوان کے' کا دیباچہ بنا۔خط پر ۲۷ اگست ۱۹۵۷ ء کی تاریخ ہے جبکہ منٹو کی وفات ۱۹۵۵ کو ہوئی، وغیرہ باتوں کا ذکر مضمون نگار نے کیا۔اس خط کے ذکر نے معلومات میں اضافہ کیا۔کے کے کھلر نے شکایت کی کہ آج تک کسی ادیب کی توجہ منٹو کی سوانح لکھنے کی طرف نہیں گئی اور نقاد پر الزام لگایا کہ وہ منٹو اور قاری کے درمیان کھڑا ہوکر رہنمائی کے نام پر بھٹکاؤ پیدا کررہا ہے۔فاضل مضمون نگار نے منٹو کے تعلق یہ رائے قائم کی کہ ''منٹو سچائیوں کا متلاشی ایک بے باک فن کار تھا جس نے عمر بھر جھوٹ، فریب، دھوکا دہی اور گندگی کے

جنگلوں میں سچائیوں کے پھول چننے کی کوشش کی ہے اور زندگی سے جو کچھ پایا ہے وہی اپنے افسانوں کی شکل میں اسے لوٹا دیا ہے'' (ص ۲۰) اس کے علاوہ انہوں نے منٹو کے طوائف کرداروں پر اس انداز سے روشنی ڈالی کہ قاری کے دل میں طوائف سے نفرت نہیں ہم دردی پیدا ہوتی ہے۔ منٹو کو قفنس سے تشبیہ دی اور قفنس نامی پرندے کی وضاحت بھی کر دی کہ جس کی عمر ہزار برس ہوتی ہے اور جو خود اپنے راگ کی وجہ سے لگی ہوئی آگ میں جل جاتا ہے اور جب بارش کا پہلا قطرہ اس راکھ میں گرتا ہے تو اسی راکھ سے ایک نیا قفنس پیدا ہوتا ہے۔ مضمون معلومات افزا ہے لیکن شدت جذبات اس کی کمزوری ہے۔

پروفیسر صادق نے اپنے مضمون 'اردو کی اولین نثری نظم اور منٹو' میں اردو میں اولین نثری نظم لکھنے کا سہرا منٹو کے سر باندھنے کی کوشش کی۔ مضمون تحقیقی مزاج کا ہے۔ تحقیق کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے یہ مضمون نہایت کارآمد ہے۔ نئے لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتا ہے۔ تحقیق کس طرح کی جائے حوالے کیسے ہوں اور مضمون میں کس طرح ان حوالوں کو موثر انداز میں پیش کیا جائے۔ یہ سب باتیں اس مضمون میں موجود ہیں۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ منٹو نے اپنی پہلی نثری نظم 'زندگی' نامی ایک فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھی تھی جو ۱۹۴۲ء میں لاہور سے پہلی بار شائع ہوئی تھی اور اب وہ منٹو کے مضامین' نامی کتاب میں شامل ہے۔ ان کا کہنا ہے: ''اس نظم میں زندگی ہے اور اس زندگی کے اندر حرکت ہے۔ ایک لطیف حرکت، ایک پیارا ارتعاش ہے۔ ایسا ارتعاش جو کنواری لڑکیوں کے جسم پر طاری ہوا کرتا ہے۔' (ص ۲۹) پروفیسر صادق نے منٹو کی دو آزاد نظموں کے بھی حوالے دیئے اور اپنے دعوے کو مضبوط بنانے کی بھرپور کوشش کی۔

پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون 'منٹو کی حقیقت نگاری۔ چند اشارے' میں منٹو کو پریم چند کے بعد سب سے بڑا حقیقت نگار قرار دیا۔ انہوں نے منٹو کے افسانوں کے حوالوں سے منٹو کی حقیقت نگاری کی تہ در تہ پرتیں کھولنے کی کوشش کی اور حقیقت نگاری کے مختلف روپ کی وضاحت کرتے ہوئے حقیقتوں کے اس نازک فرق کو گرفت میں لینے کی کوشش کی جس سے حقیقت کا سچا اور تیکھا عرفان حاصل ہو۔ مضمون ترقی پسند نظریۂ تنقید کا عکاس ہے۔ فاطمی صاحب نے یہ دعوے بھی کیا کہ مکمل منٹو ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا۔ انہوں نے لکھا ہے: ''جس دن مکمل منٹو سمجھ میں آ گئے اسی دن منٹو کی موت ہو جائے گی' البتہ یہ ضرور ہے کہ جیسے جیسے سماج کی ناہمواریاں، کمینگی، حرام زدگی فزوں تر ہوتی جائے گی اور معاشرہ کے درون کا پیچیدہ و غلیظ حصہ بنتی جائے گی منٹو کی تہہ دار معنویت اور حقیقت کے در وا ہوتے جائیں گے اور نت نئی حقیقتوں کے پردے سرکتے جائیں گے۔ بڑے فن اور فن کار کی عظمت کی یہی اصل پہچان ہوتی ہے کہ ہر دور میں اس کی معنویت نت نئے انداز اور انوکھے زاویہ سے ہوتی ہے اور وہ ہر عہد کا ساتھ نبھاتا رہتا ہے۔ یہی منٹو کی عظمت کا راز ہے۔'' (ص ۴۳) یہ مضمون حقیقت نگاری کو سمجھنے کے حوالے سے بہت اچھا ہے لیکن جذباتیت اس میں بھی در آئی ہے، تنقید جس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

نور شاہ کا مضمون 'منٹو اور فلم' معلومات افزا ہے۔ منٹو شناسی میں معاون بھی ہے۔ منٹو کا نام آتے ہیں افسانہ نگاری کے بعد ذہن اگر کسی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ فلم ہے۔ منٹو کا تعلق فلم نگری سے گہرا رہا ہے۔ مضمون میں فلمی دنیا سے منٹو کی وابستگی کو ان کے معاشی حالات کے پس منظر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس مضمون سے منٹو کی روز مرہ زندگی کے بہت سے در وا ہوئے ہیں۔ بہ حیثیت افسانہ نگار منٹو کی مقبولیت کے بعد ان کی ۲۲ برس کی عمر میں فلمی دنیا کے جرائد 'مصور' اور 'فلم انڈیا' سے وابستگی، چالیس روپئے ماہانہ تنخواہ سے ملازمت کا آغاز، منٹو کا فلمی منشی کہلانا، بھارت فلم کے لیے پہلے پہل مکالمہ نویس کی حیثیت سے کام کرنا، پھر امپیریل فلم کمپنی میں بطور اسکرپٹ رائٹر ملازمت اختیار کرنا، فلمی کہانیوں کی تکنیک سے واقف ہونا، منٹو کا فلمی کہانی لکھنا، ان کی لکھی کہانی کو کسی اور کے نام سے فلمایا جانا، فلم سٹی، ہندوستان سنے ٹون، سے وابستگی، منٹو کی کہانی 'کیچڑ' کا نام بدل کر 'اپنی نگریا' رکھ دینا، ۱۹۴۱ء میں فلم کی نمائش کے بعد عجیب واقعہ پیش آنا، فلم میں منٹو کا نام بطور کہانی کار تو تھا لیکن مکالمہ نویس کی حیثیت سے کسی اور کا نام تھا۔ منٹو کا حالات سے سمجھوتہ کر لینا، فلمی دنیا سے منٹو کی مایوسی، دوبارہ مصور کی ادارت میں شامل ہونا، کچھ دنوں بعد دوبارہ فلم دنیا میں آنا اور کردار کی حیثیت سے فلم میں کام کرنا، غالبؔ کی زندگی کے تعلق سے مواد اکھٹا کرنا اور ان پر فلم کی کہانی ترتیب دینا راجندر سنگھ بیدی کا منٹو کے پاکستان چلے جانے کے بعد غالبؔ پر منٹو کے مواد کی مدد سے فلم بنانا وغیرہ منٹو کی زندگی سے متعلق اہم واقعات کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے جو ادب کے شائقین کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں۔

واقفؔ صاحب کا مضمون 'سعادت حسن منٹو کی ضدی فطرت' اچھوتا اور نیا ہے اس میں انہوں نے منٹو کا مجازؔ اور کیٹسؔ کی عمر سے موازنہ کرتے ہوئے یہ

بتانے کی کوشش کی کہ اچھے لوگ خدا کو بہت جلد پیارے ہوجاتے ہیں اور اپنی قلیل زندگی میں وہ جو کچھ کرتے ہیں ان کے کارنامے طویل زندگی بسر کرنے والوں کے مقابلے میں کسی بھی طرح کم نہیں ہوتے ۔انہوں نے منٹو کو بیدی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر جیسے افسانہ نگاروں سے بلند تر قرار دیا۔مضمون نگار نے منٹو کا پہلے دسویں اور بعد میں بی اے میں فیل ہونا خصوصاً اردو کے پرچے میں فیل ہونا لڑک پن میں قلم و قرطاس سے منٹو کا گہرا رشتہ استوار ہونا، بچپن سے منٹو کے ذہن کا انقلابی ہونا، بہ حیثیت مترجم منٹو کا ادبی دنیا میں داخل ہونا، منٹو کے تراجم کا ماہ نامہ 'عالم گیر' کے روسی ادب میں شائع ہونا منٹو کا روسی افسانہ نگاروں' چیخوف گورکی، اور ترگنیف کا گرویدہ ہونا اور ان کے تتبع میں بہ حیثیت افسانہ نگار، ادبی دنیا میں قدم رکھنا۔کہانی نویسی میں اپنے ہم عصروں' بیدی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی جیسے فن کاروں سے الگ اپنی ایک نئی راہ بنانا، امراؤ جان ادا سے مختلف طوائفوں کو اپنے افسانوں کا محور بنانا، ترقی پسند تحریک کے ارباب بست و کشاد کا منٹو کو رجعت پسند کہہ کر ان سے دوری اختیار کرنا، وغیرہ اہم باتوں سے واقفیت کرائی ہے۔ترقی پسندوں کے منٹو سے اس طرح کی دوری کی وجہ فاضل مضمون نگار نے یہ بتائی کہ منٹو کی ہر تحریر کا سرنامہ ۸۶ء سے شروع ہوتا تھا، انہوں نے عصمت کے افسانے 'لحاف' ترقی پسندوں کے خاموشی اختیار کرنے اور منٹو کے افسانوں پر رجعت پسندی کا الزام لگارنے پر سوال قائم کرتے ہوئے یہ کہا کہ منٹو کا خدا کی ذات پر یقین ہونا یہی ایک سبب تھا جس کی وجہ سے ترقی پسندوں نے انہیں رجعت پسند ٹھہرایا۔اس علاوہ منٹو کے افسانوں کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ منٹو اپنے افسانے کی تکنیک اور موضوع و مواد کی اہمیت سے واقف تھے۔

اسلم پرویز نے اپنے مضمون 'بھونک کر بتانے والی بات' ٹیٹوال کے کتے کی کہانی خود اس کی زبانی'' میں اس بات پر زور دیا کہ منٹو کے افسانے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور 'ٹیٹوال کا کتا' دونوں ایک ہی تخلیقی رویہ کے دو اسلوبیاتی مظہر ہیں۔نفرتوں نے کھینچی ہوئی سرحدوں کی لکیر سے منٹو کی سخت ناراضگی، شراب کی ایک بوتل کے لیے روز ایک افسانہ لکھنا، ذہنی، معاشی اور جذباتی بکھراؤ کے باوجود منٹو کے افسانوں میں کہیں انتشار کا نہ ہونا جیسی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ منٹو نے 'ٹیٹوال کا کتا' ۱۹۵۵ء میں لکھا جو تقسیم کے المیے پر تقسیم کے واقعے کے ۵ برس بیت جانے کے بعد بھی اس کی ہولنا کی مندمل نہیں ہونے کا ثبوت ہے۔منٹو کے عام افسانوں کی بہ نسبت اس کا ایک چوتھائی حصہ موسم کے بیان اور سپاہیوں کی باہمی گفتگو، ان کی رومانی یادوں اور گیتوں پر محیط ہے۔مضمون نگار نے منٹو کے اس قول کا حوالہ دیا کہ ''افسانے کا پہلا جملہ میں لکھتا ہوں اور بقیہ افسانہ وہ جملہ لکھواتا ہے'' مضمون نگار نے ایک نئے پیرائے میں یہ مضمون لکھا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور معنی خیز بھی۔

م۔ناگ اردو افسانے کا بڑا نام ہے انہوں نے اپنے مضمون 'منٹو ایک سرسری جائزہ' میں منٹو کی ۴۲ برس ۸ ماہ ۴ دن کی حیات میں منٹو نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کا سرسری جائزہ لیا۔اس جائزے میں م۔ناگ نے منٹو کے کرداوں کا تجزیہ کیا' سوگندھی' ممی، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ممد بھائی، سراج، منگو کوچوان، موذیل اور خوشیا کو افسانوی ادب کے لازوال کردار قرار دیا۔م۔ناگ کا کہنا ہے ''منٹو کی کہانیوں میں کردار ڈرائیونگ سیٹ پر ہوتے ہیں جو طے کرتے ہیں کہ واقعات کس طرح بدلیں گے۔واقعات طئے نہیں کرتے کہ کردار کا رول کیا ہوگا اور جب تک کردار کا کنفلکٹ سوسائٹی میں زندہ ہے تب تک اس کی کہانیاں پڑھی جائیں گی جب تک خیر و شر زندگی ہیں قائم ہیں تب تک منٹو قائم ہے منٹو کا سفر ریل کی پٹری کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ ندی کی طرح اپنے راستے خود بناتا ہے۔'' (ص ۲۷) اس مضمون میں موصوف نے منٹو کے شخصیت اور فن کا شستہ ذوق اور متوازن نقطہ نظر سے تنقیدی مطالعہ پیش کیا۔منٹو کی خوبیاں اور خامیاں دونوں کو سیدھے سادے انداز میں قاری کے سامنے رکھ دیا۔دراصل منٹو نے کاغذی کتابوں سے زیادہ کتاب حیات کا عمیق گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔م۔ناگ نے اس سرسری جائزے میں حیات منٹو کے بہت سے پوشیدہ گوشوں وا کیا۔منٹو کا بچپن، ان کے والد کی سخت مزاجی، سوتیلے بھائیوں کی بدسلوکی، منٹو کا گھر سے فرار ہونا، بمبئی میں قیام، فلم سے وابستگی، کسم پرسی میں شادی، لاکھوں روپے کمانا اور فراخ دلی سے خرچ کرنا، منٹو کا اپنے خلاف تنقید نہ برداشت کرنا، منٹو کا افسانہ نگار مدھو سدن کو یہ مشورہ دینا کہ 'کتابوں کے مطالعے سے زیادہ زندگی کا مطالعہ کرو، زندگی کے خدوخال کا جائزہ لو، اس کے بعد لکھو، اداکار اشوک کمار کی مہمان نوازی کا دلدادہ ہونا، الغرض اس مضمون میں منٹو کی نجی زندگی اس کے فن پر م۔ناگ کی یہ سرسری نظر اپنے اندر بھرپور وسعت رکھتی ہے۔

منٹو نہ صرف اچھا افسانہ نگار تھا بلکہ اسے خاکہ نگاری میں بھی ملکہ حاصل تھا اس اردو میں بڑے جاندار خاکے لکھے۔منٹو کی خاکہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

'کے عنوان سے ڈاکٹر منیر نیازی کا ایک اچھا مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔جس میں انہوں نے خاکوں کے مختلف اقسام بتاتے ہوئے منٹو کی خاکہ نگاری کا مجموعی جائزہ لینے کی مقدور بھر کوشش کی۔منٹو اور کرشن چندر کی خاکہ نگاری کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کرنے کی سعی کی۔منٹو کے جناح،عصمت نسیم بانو،اور نرگس وغیرہ پر لکھے ہوئے خاکوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ منٹو کے ایمان ویقین کا چراغ پورے اعتماد ساتھ تادم حیات جلتا رہا اور اسی وجہ سے ان کے خاکوں میں توازن واعتدال برقرار رہا۔

منٹو کی افسانہ نگاری پر ایک مضمون ڈاکٹر ظہیر کا شامل کتاب ہے اس میں انہون نے جو تمہید باندھی اس میں بے طوالت نظر آتی ہے جس کی وجہ سے قاری کی گرفت سے یہ مضمون نکلتا جاتا ہے کیوں کہ منٹو کی افسانہ نگاری پر کچھ لکھنا ہو تو اس میں بہت ریاض گہرے مطالعے کی ضرورت ہے منٹو کی افسانہ نگاری پر اب تک علمائے ادب نے اتنا لکھا ہے کہ اس کا شائد ہی کوئی گوشہ تشنہ رہا ہو۔اب منٹو کی افسانہ نگاری پر مضمون لکھنا چونسے ہوئے گنے سے رس نکالنے کے مترادف ہے جس کے لیے لوہے کے دانت کی ضرورت ہوتی ہے۔غرض اس مضمون میں نئی اور کوئی قابل ذکر بات مجھے نظر نہیں آئی۔ڈاکٹر تعظیم احمد کاظمی کا مضمون 'تقسیم وطن اور منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ' کسی حد تک قاری کو متاثر کرتا ہے۔مضمون نگار نے تقسیم وطن کے پس منظر میں ٹوبہ ٹوک سنگھ کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ایک مضمون 'منٹو شخصیت کا مختصر ترین مطالعہ' کے عنوان سے شامل اشاعت ہے جس میں منٹو کی شخصیت پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے منٹو کی ادبی خدمات کو تین ادوار میں منقسم کر کے پیش کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ منٹو کی آخری ادبی خواہش پنجاب کی بولیوں کو جمع کر کے شائع کرنے کی تھی۔

پرکار صاحب نے کتاب کے آخر میں منٹو اور ان کے متعلقین کی ۱۶ خوبصورت تصاویر کو جگہ دی۔ان میں منٹو کے بچپن،لڑکپن اور جوانی کے مختلف مواقع پر لی گئی تصویروں کے علاوہ منٹو کی اہلیہ صفیہ اور تین لڑکیوں نصرت،نگہت اور نزہت کے بھی بچپن،لڑکپن اور جوانی وضعیفی کی تصویریں قاری کے دلچسپی کا باعث بنتی ہیں اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ان تصویروں کو مرتب نے منہ بولتی بنانے کے لیے ہر تصویر کے نیچے اس کے مناسبت سے اردو کے ایسے اشعار تحریر کئے جو ان کو مغنی بنانے کا کام دیتے ہیں۔اس سے مرتب کی سلیقہ مندی،حسن ترتیب اور دلچسپی کی عکاسی ہوتی ہے۔پرکار صاحب اس کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں ایسا لگتا ہے ان کے مشام جاں میں شعر وادب کا رچا ہوا احساس ہے۔مذکورہ کتاب کے تعلق سے ہندوستانی پرچار سبھا کے اعزازی معتمد فروز این پیچ نے اپنی بات میں کہا ہے 'اس کتاب میں شامل مضامین منٹو کے قلم کی جولانیت کا مختلف پہلوؤں سے احاطہ کرتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ یہ اشاعت منٹو کو از سر نو سمجھنے اور پرکھنے میں مددگار ثابت ہوگی'' اس کتاب سے متعلق جو امید فروز این پیچ صاحب نے ظاہر کی وہ یقین سے ہم کنار ہے۔کیوں کہ ہمیں یقین ہے یہ کتاب منٹو شناسی میں بڑی کارآمد کتاب ہونے کا درجہ رکھتی ہے۔عبارت مختصر! پرکار صاحب نے مذکورہ کتاب کو نہایت دلچسپی،یکسوئی اور انہماک سے ترتیب دیا جو فی الواقعی منٹو کے پرستاروں کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ادبی حلقے کا ہر طالب علم اسے اپنی سنجیدہ کتابوں کی الماری میں رکھنا پسند کرے گا۔

☆☆☆